قرآنی آیتوں کا ربط حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

مولانا محمد ولی رحمانی

قرآن مجید کی آیتوں میں باہم ربط و تعلق ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو یہ ربط ظاہری ہے یا معنوی ، جلی ہے یا خفی ؟ اگر ربط نہیں ہے تو اس کی دلیل کیا ہے ؟ آیات کی بے ربطی قرآن کی بلاغت پر اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں ؟

یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دو اور دو چار کی طرح نہیں دیا جا سکتا۔!

ہر وہ شخص جو قرآن مجید سے شغف رکھتا ہو ، اس میں قرآن سمجھنے کا شعور ہو۔ اگر وہ بغور قرآن مجید کا مطالعہ کرے اور غور و فکر سے کام لے ، تو یقیناً یہ سوال پیچیدہ مسئلہ بن کر اس کے سامنے آئے گا۔ قرآن مجید کی عظمت و صداقت ، روانی و سلاست ، فصاحت و بلاغت اسے یہ کہنے پر مجبور کرے گی کہ کلام اللہ شروع سے آخر تک مربوط ہے۔ اس کی شاندار ابتدا اور کامیاب انتہا اس سے یہ کہلائے گی کہ اس معجز کلام میں باہم مضبوط ربط و تعلق قائم ہے۔ جس کی سرحدیں ایک طرف " الحمد للہ " اور دوسری طرف " والناس " سے ملتی ہیں۔

لیکن جب وہ اس مجموعہ پر تحقیقی نگاہ ڈالے گا ، اس کے مضامین کو سامنے رکھے گا ،

تو اس کتاب مبین میں جگہ جگہ ایسا محسوس کرے گا کہ ان مختلف مضامین کی آیتوں میں ایک دوسرے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ پہلی دو آیتوں میں کسی خاص چیز کا ذکر ہے اور بعد کی دو آیتوں میں اس کے بالکل مخالف متضاد مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قرآن مجید میں غور و خوض کرنے والے، خواہ وُہ طالب علم ہوں یا بڑے سے بڑے مفسرین، سبھی اس گتھی کے سلجھانے میں الجھتے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ علماء و مفسرین کا اس باب میں عرصہ سے اختلاف چلا آرہا ہے، کسی کو اس بات پر اصرار ہے کہ۔ چونکہ یہ کتاب تخلیق کائنات سے قبل لکھی جا چکی تھی، اور لوح محفوظ میں محفوظ ہو چکی تھی، اس لئے اس میں تصنیفی شان اور تالیفی ربط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور چند حضرات مختلف مضامین کی آیتوں کی ظاہری بے ربطی کی وجہ سے اس کے قائل ہیں کہ تمام آیتوں کے درمیان ربط ضروری نہیں ہے!

حضرت سیدنا الامام الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں اس موضوع پر چند جملوں میں بحث فرمائی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "قرآن مجید جس دور میں نازل ہوا اس دور کی تصنیفی نکتہ سنجیوں اور تالیفی نزاکتوں کی رعایت اس میں کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ادباء متاخرین کے ادبی رجحانات اور تصنیفی قیود و شرائط کی تلاش بے سود ہے۔ کسی کتاب کے ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے ایک جملہ کا دوسرے جملہ سے ایک پیراگراف کا دوسرے پیراگراف سے اور ایک باب کا دوسرے باب سے ظاہری ربط اور کھلی ہوئی مناسبت کا پایا جانا عہد جاہلی یا قدیم عرب کے یہاں بلاغت جزء اعظم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ شرطیں اور کتاب میں ادب کی یہ قدریں، ادباء متاخرین کی پیدا کردہ ہیں۔ قرآن کے مخاطب اول عرب قدیم ہیں انداز بیان میں ان کی رعایت کی گئی ہے۔ اس لئے آیات قرآنی میں ہر جگہ ظاہری ربط اور کھلی ہوئی مناسبت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے"

حضرت محدث دہلوی کی اس گفتگو سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ربط آیات کے باب میں ان کا کیا مسلک تھا۔ وہ کس ربط کے قائل تھے اور کس ربط کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔

انہوں نے ادبار متاخرین کی جامع قید لگا کر حقیقی معنوں میں ربط کی ایک خاص قسم کا انکار کیا ہے جو متاخرین ادبار کی ایجاد ہے، اور ربط کی دوسری تمام قسموں کے بارے میں انہوں نے خاموشی اختیار کی ہے۔

ربط کی قسمیں

اس حقیقت سے وہ مفسرین بھی پوری طرح واقف ہیں، جو آیتوں کے باہمی ربط پر اصرار کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو قرآن سے شغف ہے ان میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے پورے قرآن میں یا کسی بڑی سورۃ کی تمام آیتوں میں کھلی ہوئی مناسبت اور ظاہری ربط کا سراغ لگا لیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مفسرین جو ربط کے مسئلہ میں غلو رکھتے ہیں ربط کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں:- (۱) جلی (۲) خفی (۳) اخفی[۱]۔ اور ظاہر ہے کہ اس تقسیم کے بغیر کوئی بھی ثابت نہیں کرسکتا کہ قرآن مجید کی تمام آیتیں باہم مربوط ہیں۔ علماء نے ربط کی اور بھی بہت ساری صورتیں بیان کی ہیں، مثلاً عام[۲] و خاص، عقلی، حسی، خیالی، اور حد تو یہ ہے کہ اس ربط کو ثابت کرنے کے لئے نظیرین اور ضدین کا سہارا لینا پڑا، اور یہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہر ایک صورت اور ربط کا ثبوت ضروری[۳] ہے۔

---

[۱] ربط جلی:- وہ ربط جس کے سمجھنے کے لئے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہ پڑے۔
ربط خفی:- جس کے سمجھنے کے لئے فکر و نظر کی منزلیں طے کرنی پڑے۔
ربط اخفی:- دو آیتوں کے درمیان اتنا خفیف ربط جس کے سمجھنے کے لئے دماغ سوزی سے کام لینا پڑے، اور پھر معمولی سے معمولی مناسبت نکال لی جائے۔

[۲] یہ تقسیم حضرت علامہ بدرالدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی نے البرہان فی علوم القرآن ص۳۵ جلد نمبر ۱ میں فرمائی ہے۔

[۳] البرہان فی علوم القرآن۔

یہ کوششیں کیوں کی جاتی ہیں

سوال یہ ہے کہ علماءِ متاخرین[1]، قرآن مجید کی آیتوں کے درمیان ربط ثابت کرنے کے درپے کیوں ہیں ؟ میرے خیال میں اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ۱۔ قرآن مجید کی ترتیب توقیفی ہے، اس کی ترتیب بحکم خداوندی ہے، بندہ کو اس کی ترتیب و تالیف میں کسی قسم کا دخل نہیں ہے۔ یہ کتاب بعثت نبوی سے صدیوں پہلے لوح محفوظ میں محفوظ کی جا چکی تھی۔ جب بعثت نبوی ہوئی اور قرآن کے نزول کا وقت آیا تو پہلے اسے لوح محفوظ سے آسمان پر اتارا گیا، اور پھر وہاں سے آہستہ آہستہ ضرورت کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ خدا کا یہ کلام، خدا کے حکم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا، حضرت جبرئیلؑ کی رہنمائی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مرتب طور پر لکھواتے رہے۔ جب سلسلہ ختم ہوا تو سینکڑوں صحابہ کرام قرآن اسی ترتیب کے مطابق یاد کر چکے تھے جو لوح محفوظ میں تھی اور جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے لکھوا چکے تھے۔

اب اگر قرآن مجید کو غیر مربوط کلام مانا جائے، تو اس سے قرآن کی ترتیب توقیفی متاثر ہوگی۔ اور یہ معلوم ہوگا کہ اس کی ترتیب بندوں کے ہاتھوں ہوئی ہے، جب ہی تو اس میں ربط کا اہتمام نہیں ہے، کیونکہ خداوند کریم کی کتاب اور ربط سے خالی ہو یہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں ہے۔ ۲۔ کسی کتاب کا ربط سے خالی ہونا کتاب کی اچھائی نہیں برائی ہے۔ جس سے اس کی بلاغت و فصاحت اور شانِ تالیف پر حرف آتا ہے۔ بلکہ جو کتاب ربط سے خالی ہو، وہ حقیقی معنوں میں کتاب کہے جانے کی مستحق نہیں !

---

[1] سب سے پہلی کوشش حضرت امام ابوبکر نیشاپوریؒ نے فرمائی۔ آپ کی پیدائش مشہور مردم خطہ نیشاپور میں ہوئی۔ زندگی کا اکثر حصہ بغداد میں گزرا ۳۲۴ھ میں وہیں وفات ہوئی (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃ)۔ امام مزنی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ شافعی المسلک اور فقہ شافعی کے امام ہیں اپنی فقیہانہ بصیرت، محدثانہ مہارت کی وجہ سے معاصرین میں بہت ممتاز۔

اس لئے قرآن مجید میں ربط کا ثابت کرنا ضروری ہے۔

ان کوششوں کی ضرورت نہیں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کلام اللہ کو غیر مربوط بھی مان لیا جائے تو بھی اس کی جلالت شان، اس کی توقیفی ترتیب یا اس کی فصاحت و بلاغت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کلام اللہ زندگی کا ایک جامع دستور اور کتاب ہدایت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کرے کہ اس میں عام مرتب دستوروں اور ملکی قوانین کی طرح تمام قوانین مختلف اور ممتاز ابواب میں نمبروار علیحدہ علیحدہ کیوں نہیں بیان کئے گئے، یا یہ کتاب ہدایت دوسری تصانیف کی طرح مختلف ابواب۔ فصلوں اور پھر ذیلی عنوانات پر مشتمل کیوں نہیں ہے؟ تو کیا آپ اس کے جواب میں تمام سورتوں کو ابواب، تمام رکوعات کو فصل اور تمام آیتوں کو ذیلی عنوان قرار دے کر اسے کتاب ہدایت، ثابت کرنے کی کوشش کریں گے؟

اگر اس کا جواب "نہیں" اور یقیناً "نہیں" ہے تو پھر ٹھیک اسی طرح ربط کے ثابت کرنے میں غلو سے بھی کام لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ربط کی شرط لگا دینا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا نام کتاب ہدایت سن کر اس میں ابواب۔ اور فصلوں کے وجود کی شرط لگا دینا۔

جس طرح ابواب اور فصلوں کا نہ ہونا، یا تمام قوانین کا نمبروار درج نہ ہونا قرآن مجید کی "شان ھدٰی" کو متاثر نہیں کرتا ہے۔ اور نہ اس کی جامع دستوری حیثیت پر حرف گیری کا موقع بہم پہنچاتا ہے ٹھیک اسی طرح تمام آیتوں کے درمیان ربط کا نہ ہونا قرآن مجید کی ترتیب توقیفی یا اس کی فصاحت و بلاغت کو متأثر نہیں کر سکتا!

ترتیب توقیفی کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں ہی نہیں، الفاظ اور حروف بھی اسی ترتیب کے ساتھ آج موجود ہیں جس ترتیب کے ساتھ لوح محفوظ میں تھیں۔ اور یہ ایک مستند اور صحیح حقیقت ہے، جس کا انکار جاہلانہ جسارت کے

علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔!! لیکن اس میں ربط کی شرط کا دوسری صدی ہجری کے اواخر کی چیز ہے اس سے پہلے کسی کے ذہن میں شاید یہ چیز نہ آئی ہو، جس کی وجہ بہت صاف اور ظاہر ہے۔ قرآن مجید جس وقت نازل ہوا اس وقت کسی طویل کلام کے حسن و قبح کا معیار یہ نہ تھا کہ اس کلام کے تمام اجزاء یا اس کے اکثر اجزاء باہم مربوط ہوں، کسی شاعر یا انشاء پرداز کے کلام کی خصوصیت یہ نہ تھی اور نہ اس کے بلاغت کا معیار ہی یہ تھا کہ اس میں ظاہری ربط و تسلسل قائم ہو، بلکہ ایک بات پوری کرنے کے بعد وہ پھر کوئی نئی بات شروع کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا تھا، خواہ وہ بات ایک جملہ میں مکمل ہو جائے یا دس جملوں میں، ایک شعر میں ہو یا دس اشعار میں، شعرائے جاہلیت کے اشعار، فصحاء عرب کی تقریریں اس بات کی شاہد ہیں۔ حتیٰ کہ غلط دعویٰ نبوت کے بعد اگر کسی نے کبھی اپنا کلام پیش کرنے کی غلط جرأت کی بھی تو اس میں اس نے انداز قرآن کی رعایت تو کی، عام طور پر ربط و تسلسل کی رعایت نہیں کی حالانکہ اگر ربط معیار بلاغت ہوتا تو نبوت کا مدعی اس کی رعایت ضرور کرتا[1]۔

زبان کی قدریں بدلتی رہتی ہیں، ادبی رجحان میں انقلاب آتا رہتا ہے، اسلوب بیان اور طریق تعبیر ہر دور میں یکساں نہیں رہتا، ایک چیز کسی دور میں پسند کی جاتی ہے، مگر کچھ دنوں بعد وہ متروک ہو جاتی ہے، کبھی ناپسندیدہ چیزیں عہد کے بدلنے سے پسندیدہ چیزوں کی صف میں شامل ہو جاتی ہیں۔ فصاحت کے سانچے بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں، بلاغت کے پیمانے ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں، اگر آپ کی

---

[1] اشارہ مسیلمہ کذاب کی طرف ہے دعویٰ نبوت کے بعد جب اس سے "کلام" کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے کچھ چیزیں پیش کیں، جس کا ایک جزیہ بھی ہے "یا ضفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین لنا نصف ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون" طبری ص ۲۵۳ جلد ۳ (ترجمہ) اے مینڈک کی ٹرٹرانے تو پانی پینے والے کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گندہ کرتی ہے، آدھی زمین ہمارے قبضہ کی ہے اور آدھی، قریش کی مگر قریش زیادتی سے کام لے رہے ہیں۔

اہش ہو کہ کسی دور کے اونچے سے اونچے کلام کو دوسرے دور کے اسالیب پر پرکھیں
روہ اس پر پورا اترے، کلام قدیم کو نئے عہد کی قدروں کے زاویوں سے ناپیں اور یہ
مل درست ہو، تو یہ کلامِ قدیم کے ساتھ ظلم ہوگا۔ جس نے علم و نظر کی جبیں شکن آلود
گی۔ ہاں! ہر زبان کے ادب کی کچھ بنیادیں ہوتی ہیں جسے ہم ادب یا زبان کی
رح سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو ہر دور، ہر عہد، ہر زمانے کے ادب میں قدرِ مشترک
ے طور پر باقی رہتی ہے۔ یہی قدرِ مشترک جانچنے، پرکھنے اور تقابل کا اصل معیار ہوا کرتا
ہے۔ آپ خود غور کریں کہ اگر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے اسلوب کو معیار بنا کر قرآن مجید کو جانچا
جائے تو کیا حشر ہوگا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا اسلوب خواہ کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، وہ کبھی
عیار نہیں بن سکتا، اگر کوئی چیز معیار بن سکتی ہے تو وہ فکری وسعتیں، نظر کی گہرائیاں،
بیان کی لطافت ادب کی چاشنی، اصول و قواعد کی رعایت اور اسی قسم کی دوسری
چیزیں بن سکتی ہیں، جسے ہم قدرِ مشترک سے تعبیر کرتے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ کلام کا باہمی ارتباط جسے آج کے ادب میں اہم حیثیت حاصل
ہے نزولِ قرآن کے زمانہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، اس لئے اسے معیار یا
مظہرِ بلاغت کہنا اور اس کے ذریعہ قرآن کو جانچنا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ میں
نے عرض کیا، ربط کا تصور بعد میں پیدا ہوا۔ جن لوگوں نے ربط ثابت کرنے کی کوششیں
کی ہیں، ان میں سب سے پہلا نام حضرت امام ابوبکر نیشاپوریؒ آتا ہے۔ امام فخر الدین
رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سلسلہ میں بڑی محنت و مشقت برداشت کی۔ ان حضرات

لے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا طرزِ نگارش آج کوئی اختیار نہیں کرتا۔ مولانا کی تحریریں
سخت اور ثقیل الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہیں، جب کہ آج دور ہے سہل نگاری کا کوئی ادیب ثقیل
الفاظ کا استعمال پسند نہیں کرتا مگر پھر بھی مولانا کی تحریریں ادب اردو میں بہت بلند مرتبہ
رکھتی ہیں، خواہ ادباء وہ طرزِ نگارش اپنائیں یا نہ اپنا سکیں۔ (خدانخواستہ قرآن سے مقابلہ
مراد نہیں، صرف مثال کے ذریعہ سمجھانا مقصود ہے)۔

کے علاوہ بعض دوسرے مشہور مفسرین اور علماء نے بھی اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ ان تمام حضرات کے بے پناہ علم، غیر معمولی قوت فکر، قرآن کے سمجھنے اور سمجھانے کے پورے استحقاق کے اعتراف کے باوجود بے لفظوں اس حقیقت کے اظہار کی جرأت کرنی پڑتی ہے کہ یہ سارے مفسرین عجمی تھے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ربط کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب عربی ادب میں عجمی عناصر شامل ہو چکے تھے، اس لئے علماء عجم نے اس مسئلہ کو بھی حروف مقطعات کے مسئلہ کی طرح مستقل موضوع بحث بنا دیا۔

حضرت محدث دہلویؒ کے مسلک کی مختصر وضاحت

جہاں تک اپنے محدود اور طالب علمانہ مطالعہ کے بعد میں نے سمجھا ہے یہی وہ نقطہ نظر ہے جس کو سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب سمجھا اور ربط بین الآیات کے مسئلہ میں آپ نے شدت اختیار نہیں کی جس کا لوگوں کو شکوہ ہے۔ آپ کے علاوہ بھی جن حضرات نے اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ ان کے پیش نظر بھی یہی حقیقت تھی۔

حضرت محدث دہلویؒ کی تحریر سے اگر تمام چیزیں جمع کی جائیں جو ربط کے متعلق انہوں نے لکھی ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ قرآن مجید کی تمام آیتوں کے درمیان ربط کی صرف ایک قسم ربط جلی کا انکار کرتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ ربط خفی کا اور وہ بھی کلیۃً ہر جگہ نہیں کیونکہ بہت سے مقامات میں وہ ربط کے قائل ہیں۔ اور جہاں تک ربط اخفی کا تعلق ہے، صراحۃً تو کیا معنی کنایۃً بھی اس کا ثبوت حضرت دہلویؒ کی تحریر سے نہیں ملتا۔ حضرت محدث دہلوی یا ان جیسے دوسرے مفسرین نے جہاں جہاں بھی ربط کا انکار کیا ہے، اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہاں انکار ربط جلی یا خفی کا ہے، اخفی کا ہرگز نہیں۔

حضرت محدث دہلویؒ کے مسلک کی مختصر سی تشریح کے بعد آپ خود الفوز الکبیر کی وہ عبارت ملاحظہ فرمائیں، جس سے بعض علماء کو غلط فہمی ہوئی۔

مناسبت در انتقال از مطلبے بمطلبے چنانکہ قاعدہ ادبائے متاخرین است رعایت نکرد بلکہ آنچہ القا آن بعباد خود مہم دانست آنرا نشر فرمود۔

(الفوز الکبیر ص۳ مطبوعہ مجتبائی ۱۹۲۲ء)

خدا تعالیٰ نے ایک مضمون کے بعد دوسرے مضمون کو بیان کرتے ہوئے اس مناسبت و ربط کی رعایت نہیں فرمائی جس کی متاخرین ادبا کیا کرتے ہیں بلکہ قرآن مجید میں ان چیزوں کو خدا نے بیان فرمایا جسے اس نے بندوں کے لئے ضروری سمجھا۔

قرآن مجید میں ادبا، متاخرین کے اسلوب کی رعایت نہیں ہے تو پھر قرآن کا اسلوب کیا ہے؟ حضرت محدث دہلوی ہی کے الفاظ ہی میں سنئے۔ "علم تذکیر بآلاء اللہ، علم تذکیر بایام اللہ" علم تذکیر بموت کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔

وبیان این علوم بروش تقریر عرب اول واقع شدہ نہ بروش تقریر متاخران پس در آیت احکام اختصار کہ قاعدہ متن نویسان است وتنقیح از قیود غیر ضروریہ کہ صناعت اصولیان است التزام فرمود، ودر آیات مخاصمہ التزام بمشہورات مسلمہ و خطابیات نافعہ اختیار نمود تنقیح براہین بروش منطقیان۔

(الفوز الکبیر ص۳)

ان علوم کی بحث عرب اول کے انداز پر کی گئی ہے نہ کہ متاخرین کے انداز پر، اس لئے متن نویسوں کی طرح احکام کی آیتوں میں اختصار سے کام نہیں لیا گیا اور نہ اصولیوں کی طرح غیر ضروری شرائط وقیود سے قواعد کی تنقیح کی گئی ہے، اس لئے آیات مخاصمہ میں گھسے پٹے دلائل وبراہین کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا ہے اور نہ منطقیوں کے انداز پر دلائل کے نوک و پلک کو سنوارا گیا ہے۔

اور . . . . .

در ابتدا وانتہا طریق مکاتیب رعایت نمودہ شدہ۔ (ایضاً ص۳۲)

شروع سے آخر تک مکتوب یا پیغام کا سا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اتنے ہی پر بس نہیں، خود حضرت محدث دہلوی یہ سوال قائم کرتے ہیں:۔

اگر پرسند کہ در سورت ہائے قرآن این مطالب را چرا نشر فرمودند ورعایت

اگر یہ پوچھا جائے کہ قرآن مجید میں ان مطالب و مفہوم کو بیان کرتے ہوئے ربط و ترتیب کا

ترتیب نکردند۔ (ایضاً ص۳) ۔

پورا پورا لحاظ کیوں نہیں رکھا گیا۔

اور پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

اگرچہ قدرت الٰہیہ شامل ہمہ ممکنات است اما حاکم دریں ابواب حکمت است وحکمت موافقت مبعوث الیہم است در لسان و در اسلوب بیان۔ (ایضاً ص۳)

خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے یہ کوئی بعید بات نہ تھی لیکن موجودہ اسلوب کے مطابق قرآن کو مرتب و مربوط طور پر پیش کرنے میں ایک حکمت ہے اور وہ یہ کہ اسلوب بیان ادب وزبان میں ان کی رعایت کی جائے جو قرآن کے مخاطب اول ہیں۔

مخاطب اول یا مبعوث الیہم کی رعایت کی گئی ہے، بہت مناسب! مگر کیا نزول قرآن کے بعد کسی دور میں بھی اس "رعایت" سے قرآن کی بلاغت متاثر ہوئی یا ہو سکتی ہے؟ کیا تعلیمات قرآنی کو اس سے اچھے انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے؟ ان شکوک و شبہات کا جواب خود حضرت محدث دہلوی سے سنئے:۔

عالم اسرار شرائع می داند کہ در تہذیب نفوس کدام کدام چیز با فراد انسان می تواں القا نمود بعد ازاں در فنون خمسہ تامل می کند بیشک در می یابد کہ ایں فنون در معانی خود بوجہی واقع اند کہ ازاں بہتر صورت نہ بندد۔ (الفوز الکبیر ص۳۹)

شریعت کے اسرار و رموز کو جاننے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں کون کون سی چیزوں کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی فنون خمسہ پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ تو یقیناً اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن میں ان فنون خمسہ کی تعبیر کے لئے جو الفاظ منتخب کئے گئے ہیں، اور مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جو زبان اختیار کی گئی ہے اس سے بہتر اور معیاری زبان نہیں استعمال کی جا سکتی اور ان فنون کے لئے قرآن نے جو جگہ منتخب کی ہے، اس سے عمدہ جگہ کا انتخاب بھی ناممکن ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ کے مسلک کی دوسری تشریح

اب آپ حضرات سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مسلک کی

دوسری تشریح ملاحظہ فرمائیں[1]۔ (اقتباس ذرا طویل ہے مگر مکمل نقل کئے بغیر چارہ نہیں)۔

کہنا یہ ہے کہ عام انسانوں کی تحریر و تقریر میں بھی بے ربطی ہمارے آپ کے نقطۂ نظر سے بڑا عیب ہے یا نہیں، دیوانہ کا کلام، مجذوب کی ایک بڑ آخر آپ کے یہاں ناقابل التفات کیوں ٹھہری اسی لئے نا کہ اس کی باتوں میں کوئی جوڑ کوئی تک ربط و تعلق آپ کو نظر نہیں آتا، کسی مشہور اور مسلّم انشاء پرداز، محقق، مصلح کے کلام و تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ بلکہ افادیت کے اعتبار سے جاذب اور پرکشش کلام کا باہمی ارتباط اور بیان کی مختلف کڑیوں کا ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست ہونا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہے اور یقیناً ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں جو اعجاز و بلاغت کا معیار، گہرائی اور گیرائی کا آئینہ دار ہے، اس میں ربط و تسلسل ارتباط و تعلق کا انکار کیا جائے، لیکن کسی اور نے نہیں متاخرین علماء میں سے انہوں نے اختلاف کیا ہے جن کی بھاری بھرکم شخصیت کے پیش نظر نام لیتے ہوئے بھی خوف معلوم ہوتا ہے[2] کہ خدا جانے خود اس اختلاف سے کتنی

---

[1] یہ تشریح دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر جناب مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری نے اپنے مضمون "مرتب صحیفۂ الٰہی یا غیر مربوط کلام" میں بیان فرمائی ہے، جسے ماہنامہ "نظام" کانپور نے "قرآن نمبر" میں شائع کیا ہے۔

[2] تعجب ہے مولانا انظر شاہ صاحب نے یہ کس طرح کہہ دیا کہ اختلاف متاخرین کا پیدا کردہ ہے اور وہ بھی متاخرین میں صرف حضرت محدث دہلویؒ کا۔! علامہ بدرالدین الزرکشی تو خیر اتنی ہی شکایت کرتے ہیں کہ "ربط کا ثابت کرنا دقیق کام ہے اس لئے مفسرین نے اس سے بے اعتنائی برتی ہے" (البرھان فی علوم القرآن ص۳۶ جلد ۱) اور امام فخرالدین رازیؒ بھی صرف اتنا ہی فرماتے ہیں کہ "جمہور مفسرین اس دقیق فن سے کتراتے اور نگاہ بچاتے چلتے ہیں"۔ مگر الشیخ ولی الدین الملویؒ نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ "قد وھم من قال (باقی آئندہ صفحہ پر)

پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں گی۔ حالانکہ راقم السطور ان کی عقیدت و احترام میں رسمی معترفین سے زیادہ ہی ہوگا۔ لیجئے اب نام بھی سن لیجئے "امام الہند الشیخ ولی اللہ الدہلوی" اپنی مشہور و معروف اصول تفسیر پر محققانہ تصنیف کی ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

ولم یراع مناسبۃ فی الانتقال من مطلب الی مطلب کما ھو عادۃ الادباء المتاخرین بل نشر کل ما اہم القاء علی العباد تقدم او تاخر۔ (الفوز الکبیر صـ۳۷)[۱]	حق تعالیٰ نے انشاء پرداز لوگوں کی طرح ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں کسی مناسبت کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ وہ اہم مضامین کو لے آتے ہیں اور اس میں تقدیم و تاخیر کا بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بلکہ شاہ صاحب مرحوم کی نظر میں ان مفسرین کی کوششیں جو قرآن حکیم کو ایک مسلسل اور مربوط کلام دکھلانے کے لئے ہیں، نہ صرف غیر مناسب بلکہ ایک حد تک بلاوجہ کی کاوش ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

لا یطلب للآی الکریمۃ مناسبۃ" (جو حضرات یہ کہہ رہے ہیں کہ آیات میں مناسبت اور ارتباط ضروری ہے وہ وہم میں مبتلا ہیں) ظاہر ہے کسی مفسر کے اختلاف کے بعد ہی ایسا جملہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تتبع اور تلاش کے بعد ایسے مفسرین (جو ربط کے مسئلہ میں غلو سے کام نہیں لیتے) کی اچھی خاصی فہرست بن سکتی ہے۔ ایک نام تو علامہ سیوطیؒ نے بھی لکھ دیا ہے" قد غلط ابو العلا محمد بن غانم فی قولہ لم یقع فیہ فی القرآن شیٔ لما فیہ من التکلف وقال ان القرآن ورد علی الاقتضاب الذی ہو طریقۃ العرب من الانتقال الی غیر ملائم" الاتقان فی علوم القرآن صـ۱۰۹ جلد ۲۔ اس کے بعد کیس طرح کہا جا سکتا ہے کہ صرف محدث دہلویؒ ہی نے اختلاف کیا ہے۔

[۱] کسی بھی تحقیقی مضمون میں اصل کتاب کا حوالہ دینا چاہیئے اور قاعدہ کے مطابق مصنف کی اصل عبارت پیش کرنی چاہیئے نہ کہ ترجمہ! خواہ ترجمہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔ الفوز الکبیر کی یہ عبارت ترجمہ کے لحاظ سے اگرچہ بالکل صحیح ہے مگر بہرحال ترجمہ ہے اصل نہیں ہے۔

وعامة المفسرين يربطون كل آية من آية المخاصمة وآيات الاحكام بقصة ويظنون تلك القصة سبب نزولها۔ (ایضاً ص۔)	عام مفسرین خواہ ایک آیت کو دوسری آیت سے جوڑنے کی فکر کرتے ہیں اور تو اور آیات احکام اور مناظرہ کی آیات میں بھی رابطہ پیدا کرنے کے لئے کچھ واقعات شان نزول کی حیثیت سے ذکر کئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے اپنی رائے لکھتے ہوئے ربط اور ارتباط کے مسئلہ کو ایک غیر ضروری بحث قرار دے کر قرآنی مباحث کی تفصیل کے ضمن میں ربط کی ضرورت کا انکار کیا ہے۔

(ماخوذ از قرآن نمبر ماہنامہ نظام کان پور)

اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد حضرت محدث دہلوی ؒ نے گفتگو کا رخ ہی پھیر دیا ہے آپ بھی سن لیں۔ فرماتے ہیں "اما محقق آنست کہ قصد اصلی از نزول قرآن تہذیب نفوس بشر است و درہم شکستن عقائد باطلہ و اعمال فاسدہ۔(الفوز الکبیر ص۳) دراصل ربط ثابت کرنے کی کوشش اس لئے ہے کہ مفسرین نے اس کا تعلق اعجاز و بلاغت قرآن سے جوڑ دیا ہے، اور ظاہر ہے اس کے بعد اس قسم کی کوشش ضرور کی جائے گی۔ حضرت محدث دہلوی ؒ نے مفسرین کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد ہے انسان کی اصلاح اعمال فاسدہ کی درستگی اور عقائد باطلہ کا رد۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کا موضوع اور کلام اللہ کا محور یہی ہے، قرآن سے یہی کام لینا چاہئے اور اسی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ربط ثابت کرنے کے لئے مفسرین نے جن تاویلوں سے کام لیا ہے وہ عجیب و غریب ہیں ایسی تاویلوں سے تاویل نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

یہ ہے حضرت محدث دہلوی ؒ کے خیالات کی وہ تشریح جو محترم مضمون نگار نے فرمائی ہے حالاں کہ "الفوز الکبیر" کی اس عبارت سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ حضرت

محدث دہلویؒ نے ربط کا کلیۃً انکار کیا ہے۔

اس تشریح سے اختلاف

دیکھئے حضرت محدث دہلویؒ کے الفاظ "چنانکہ قاعدہ ادباء متاخرین است کماھو عادۃ الادباء المتاخرین" کسی قدر واضح ہیں، کیا اس کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ حضرت محدث دہلویؒ نے کلیۃً ربط آیات کا انکار کیا ہے؟ وہ تو صرف اس ترتیب و ربط کا انکار کر رہے ہیں جس کی رعایت ادباء متاخرین کیا کرتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ربط کی ایک خاص صنف کی طرف اشارہ فرما کر اس کا انکار فرما رہے ہیں نہ کہ تمام اصناف کا۔ قرآن مجید کا طرز تعبیر اور انداز کلام متاخرین ادیبوں سے نہیں بلکہ قدیم عرب سے ملتا جلتا ہے۔

تھوڑی سی کاوش سے اس کا پتہ بھی لگ جاتا ہے کہ حضرت محدث دہلویؒ نے ادباء متاخرین اور عرب قریب کے اسلوب کے فرق کو کہاں اشارۃً یا صراحۃً بیان فرمایا ہے۔ اگر اس تشریح کو سامنے رکھ لیا جائے تو مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

اس فرق کی مختصر تشریح صراحۃً تو نہیں اشارۃً "باب ثالث دربیان اسلوب" میں موجود ہے محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

قرآن را بروش متون مبوب و مفصل ساختہ نشدہ تا ہر مطلبے زان در بابے یا در فصلے مذکور شد۔	قرآن پاک کو متون کی روش پر ابواب اور فصلوں میں اس طرح تقسیم نہیں کیا گیا ہے کہ (متعلقہ مسئلہ کے) تمام مقاصد اسی باب یا اسی فصل میں مذکور ہے۔
(الفوز الکبیر صـ۳۱)	

حضرت محدث دہلویؒ کی یہ تشریح حقیقی معنوں میں "ادبائے متاخرین" اور "عرب اول" کے اسلوب کی وضاحت ہے۔

ادبائے متاخرین اور متقدمین کا فرق

ان دونوں طبقوں کے درمیان اسلوب میں جو امتیاز ہے اس کی تفصیل یوں کی جا سکتی

جلال الدین سیوطیؒ کا جنہوں نے اختلاف کرنے والوں کے ذکر کو نقل کیا ہے الشیخ ابوالعلاء الملویؒ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ان القرآن ورد علی الاقتضاب الذی ہو طریقۃ العرب من الانتقال الی غیر ملائم"۔ یہاں بھی الشیخ ابوالعلاء "الذی ہو طریقۃ العرب" کی قید سے تقریباً وہی کچھ کہنا چاہتے ہیں جسے حضرت محدث دہلویؒ نے "چنانکہ قاعدہ ادباء متاخرین است" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ ہر ربط کا انکار نہیں فرماتے اور دوسرے حضرات مفسرین ہر ربط پر اصرار نہیں کرتے۔ حضرت محدث دہلویؒ کا انکار صرف "ربط جلی" سے متعلق ہے۔ حضرات مفسرین کا اصرار اس پر ہے کہ "ربط اخفیٰ" ہر جگہ موجود ہے!

اب بھلا بتلائیے کہ ربط پر بظاہر اصرار کرنے اور نہ کرنے کے فرق کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو کیا ہر دو قسم کے بزرگوں میں کوئی بھی اختلاف باقی رہے گا؟ اور کیا اس اختلاف کو نزاع لفظی کے علاوہ کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے؟

حضرت مولانا خالد شہرزوری کردی رحمۃ اللہ علیہ نامآور عالم تھے، ان کو ہر فن میں عجیب وغریب استعداد تھی اور حدیث کی پچاس کتابوں کی سند حاصل تھی۔

ہندوستان کے علماء میں صرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح کی فی الجملہ تعریف کرتے تھے۔ ان کا فارسی وعربی کلام سلاست وروانی میں فردوسی و فرزدق سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ان کے پیر طریقت حضرت شاہ غلام علی صاحب رح ان کے اشعار کو عارف جامی کے ہم پلہ فرماتے تھے۔ عربی وفارسی میں جو قصیدے انہوں نے اپنے پیر طریقت کی شان میں ارشاد فرمائے ہیں وہ خسرو اور جامی کے ان قصیدوں سے کم نہیں جو انہوں نے اپنے پیران طریقت حضرت سلطان المشائخ رح اور حضرت خواجہ احرار رح کی مدح میں فرمائے ہیں۔

(تذکرہ مجدد الف ثانی)